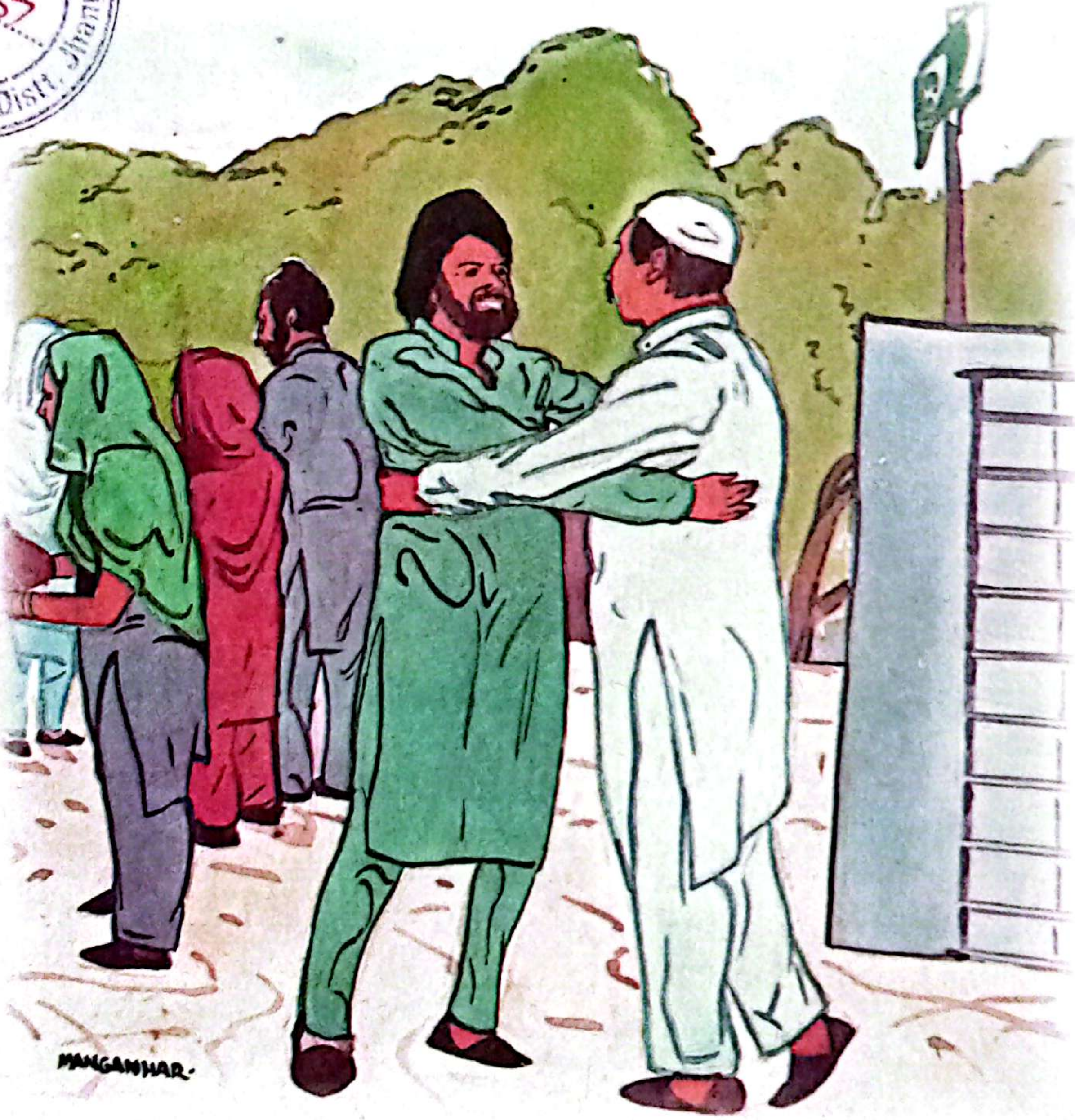
قیامِ پاکستان کی سچّی کہانیاں



قیامِ پاکستان کی سچّی کہانیاں



PMSP Punjab
ملکیت حکومتِ پنجاب

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

DFID Department for International Development

آلو ماسٹر

گھر میں کچھ بھی کھانے کو نہ تھا۔ رات کی بچی ہوئی ایک روٹی تھی،
سُورن نے وہ آلو ماسٹر کو کھلا دی تھی۔ آلو ماسٹر کا پیٹ بھرا ہو گا تو تماشہ دِکھا
کر وہ کچھ نہ کچھ کما ہی لے گا اور سب گھر والوں کو کھانا مل جائے گا۔
سُورن، آلو ماسٹر کو لے کر نکل گیا۔ لیکن یہ کیا! دوپہر ہونے کو آئی،
آج کسی نے بندر والے کو آواز بھی نہ دی۔
سُورن کا آلو ماسٹر دوبارہ بھوکا ہو چلا تھا۔ سُورن کے پیٹ میں بھی چوہے
دوڑ رہے تھے۔ ادھر گھر میں چھوٹے بچے اور ان کی ماں بھوکی تھی۔
یہ زمانہ وہ تھا جب 1947ء میں پاکستان بننے کا اعلان ہوا تھا۔
سب ہی لوگ پریشان تھے۔ بندر کا تماشہ دیکھنے کی کسی کو فرصت نہ تھی۔

''بندر والے'' کسی نے آواز دی۔ جس نے سُورن کو چونکا دیا۔
اس نے سوچا، بھگوان بھلا کرے، کسی نے آواز دے دی؟
یہ آواز شاکر نے دی تھی۔ ابو نے کہا تھا صُبح صُبح گھر سے نکلنا ہے۔
امی نے کچھ ایسی چیزیں پکالی تھیں جو وہ ٹرین میں ساتھ رکھ سکتی تھیں۔
گھر میں کسی کو فرصت نہ تھی کہ شاکر سے بات کرتا۔



بندر والے کی ڈُگڈُگی سن کر شاکر بھی خوش ہو گیا اور اسے آواز دے دی۔
ڈُگ ڈُگ ڈُگ کرتا ہوا اسُورن اپنے آلو ماسٹر کو لے کر شاکر کی کھڑکی کے
سامنے آگیا۔ شاکر نے کہا ''تماشہ دکھاؤ۔''
''بابو پہلے کچھ کھانے کو دے دو، میرا آلو ماسٹر صُبح سے بھوکا ہے۔''
بندر والے نے کہا۔
شاکر دوڑا ہوا امی کے پاس گیا کہنے لگا ''امی بندر والے کا بندر
صُبح سے بھوکا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ بندر والے کو بھی کھانا چاہئے۔
آپ کھانا دے دیں۔''

امی سوچ میں پڑ گئیں۔ نہ جانے سفر میں کتنے لوگ ہوں گے ؟ اگر یہاں کھانا خرچ ہو گیا تو سفر میں کیا ساتھ لے جائیں گے ؟ پھر سوچا کہ کوئی بات نہیں، گھر کے سامنے ایک آدمی بھوکا ہے، اس کا بندر بھی بھوکا ہے کیوں نہ یہ کھانا اس کو دے دوں ؟ قسمت میں کھانا ہوگا تو ہمیں اللہ اور دے گا۔

امی نے ڈھیر سارا کھانا اٹھا کر بندر والے کو دے دیا اور کہا۔

''پیٹ بھر کر کھاؤ، اپنے بندر کو کھلاؤ اور جو بچ جائے اپنے گھر لے جانا۔ ہمارے لئے دعا کرنا کہ ہم سب خیریت سے پاکستان پہنچ جائیں۔''

امی نے رات بھر جاگ کر سفر کے لئے دوبارہ کھانا تیار کر لیا۔

یہ لوگ پاکستان کے لئے روانہ ہوئے۔

دو دن سفر کرنے کے بعد رات کو پاکستان پہنچے۔ سب لوگوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ پاکستان کی مٹی کو چوما اور اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔

کہیں سے ایک آواز آئی۔ ''آلو ماسٹر تو بھی سجدہ کر اللہ کے حضور۔''

شاکر نے دیکھا کہ سُورن اپنے گھر والوں کے ساتھ، آلو ماسٹر کا ہاتھ پکڑے، پاکستان کی مٹی کو چوم کر اللہ اکبر کہہ رہا ہے۔

''ارے بندر والے تم یہاں کیسے ؟'' شاکر نے پوچھا۔

بندر والے کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا

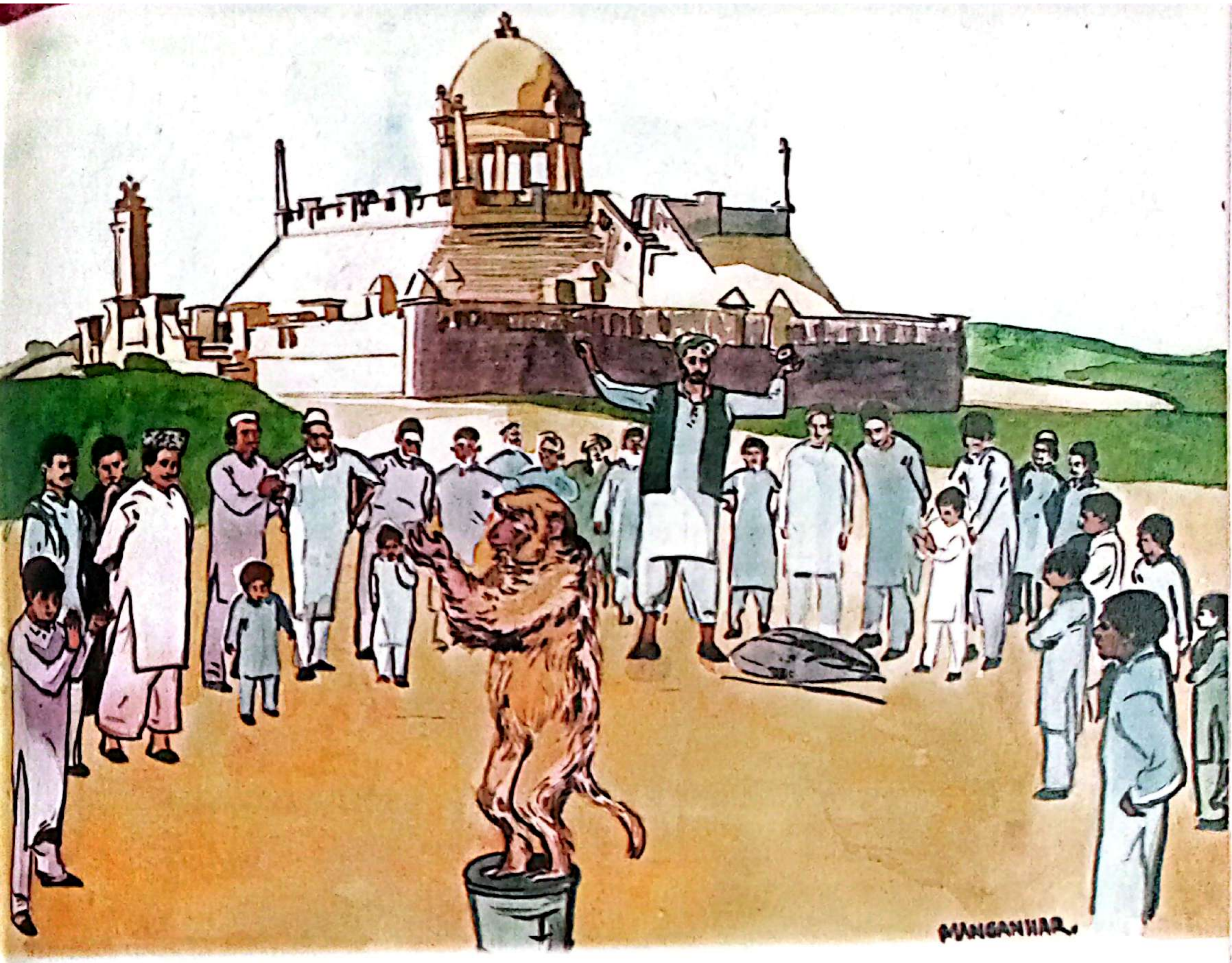
''بابو، ہندو مسلمان ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے ہیں۔ آپ نے تو



بس ایک بھوکے انسان کا، اس کے گھر والوں کا اور اس کے بندر کا پیٹ بھرا۔
اتنے لوگوں کو بھوک سے مرنے سے بچالیا۔ آپ کا ساتھ کیسے چھوڑ دیتا؟
اگر مسلمان ایسے ہوتے ہیں تو میں بھی مسلمان ہوں۔''

سُورن پاکستان آگیا اور مسلمان ہو گیا۔ وہ کراچی میں رہتا تھا اور روز کلفٹن جا کر تماشا کرتا۔ آلو ماسٹر بیس سال تک زندہ رہا لیکن روز تماشا ختم کر کے آلو ماسٹر پُھدک پُھدک کر سارے بڑوں اور بچوں کو سلام کرتا اور ڈبہ اٹھا کر پیسے مانگتا۔ پھر سُورن کہتا۔

''آلو ماسٹر اب اپنے شاکر بابو کے لئے دُعا کر کہ شاکر بابو اور ان کے گھر والے ہمیشہ خوش رہیں۔''



آلو ماسٹر ڈبے کو زمین پر رکھتا اور اس کے اوپر بیٹھ جاتا، دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھاتا جیسے دُعا مانگ رہا ہو۔

جب لوگ سُورن سے پوچھتے کہ یہ شاکر بابو کون ہیں؟ سُورن بس اتنا ہی کہتا ''ہیں ایک، اللہ کے نیک بندے۔''

(بندر والے نے اپنی یہ کہانی مجھے خود سنائی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ابھی تک شاکر بابو کے گھر میں دوپہر کا کھانا کھاتا ہے۔ 1976ء تک آلو ماسٹر زندہ رہا۔ اس کے مرنے کے چند دن بعد سُورن بھی اللہ کو پیارا ہو گیا)

لال پوٹلی

لاہور کے ایک پرانے محلے میں دو پڑوسی، ایک دوسرے کے اچھے بُرے وقت کے ساتھی، بہت پیار سے رہتے تھے۔ دونوں گھروں کے درمیان ایک دیوار تھی۔ دیوار کے ایک طرف ملک فہدان کی بیوی رُوبی اپنی بچیوں کے ساتھ اور دیوار کی دوسری طرف بسنت سنگھ اپنی بیوی اور ایک بیٹی کے ساتھ رہتے تھے۔

رُوبی روز ہی دیوار پر سیڑھی لگا کر گھنٹوں گیتا کور سے باتیں کرتی تھی۔ دونوں گھروں کی لڑکیاں بھی آپس میں گہری دوست تھیں۔ گڑیا کی شادی ہو یا کھیل کود، ہر معاملے میں سب ساتھ ساتھ رہتیں۔ اتفاق سے ملک فہد اور بسنت سنگھ ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ لیکن بسنت سنگھ کے حالات کچھ اچھے تھے۔ زمینداری کا پیسہ بھی آتا تھا اور بیٹی بھی ایک ہی تھی۔ اِدھر ملک فہد کے یہاں چار بیٹیاں اور صرف ایک دفتر کی کلرکی۔ ملک فہد چاروں لڑکیوں کو اسکول بھیجتے تھے۔ لیکن بسنت سنگھ نے گیتا کور کو میٹرک کے بعد اسکول سے اٹھا لیا تھا۔ اس کی شادی طے ہو گئی تھی۔ ماں باپ اس کی شادی کی تیاری کر رہے تھے۔



یہ زمانہ پورے ہندوستان کی تقسیم کا تھا۔ ہندو اور سکھ پاکستانی علاقے چھوڑ کر ہندوستان جا رہے تھے اور مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آ رہے تھے۔
حالات کچھ ایسے ہوئے کہ بسنت سنگھ کو راتوں رات بھاگنا پڑا۔
وہ لوگ اتنی خاموشی سے گئے کہ دیوار کے ساتھ سوئے ہوئے پڑوسیوں کو بھی پتہ نہ چلا۔

رُوبی صبح اُٹھیں تو ان کے آنگن میں ایک لال رنگ کے کپڑے کی پوٹلی پڑی ہوئی تھی۔ روبی نیند میں تھیں بے خیالی میں اٹھالی۔ پوٹلی بھاری لگی اور نہ جانے کیوں کھول کر دیکھنے لگیں۔ ارے اس کے اندر تو خالص سونے کے بہت سے زیورات تھے! رُوبی کی تو نیند اُڑ گئی۔

رُوبی نے گھبرا کر ملک فہد کو آواز دی۔ وہ دونوں فوراً پہچان گئے کہ یہ زیورات تو بسنت سنگھ کی بیٹی گیتا کے ہیں۔ یہ سب تو وہ گیتا کی شادی کے لئے نہ جانے کب سے جمع کر رہے تھے۔

دیوار پر چڑھ کر دیکھا پڑوسیوں کا گھر تو خالی پڑا ہے۔ دروازے کھلے ہیں۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ راتوں رات بھاگتے وقت بسنت سنگھ نے زیورات گھر میں چھوڑنے سے بہتر جانا ہو گا کہ دوستوں کے ہی کام آجائیں اور یہ سچ تھا کہ روبی کی دو لڑکیاں شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھیں۔
ملک فہد نے موقعہ لگتے ہی زیورات بنک میں رکھوا دیئے۔
کئی سال گزر گئے۔ ملک فہد کی بڑی لڑکی کی شادی ہو گئی۔
دوسری لڑکی کی شادی طے تھی کہ ان کو کسی کام سے ہندوستان جانا پڑا۔
ہندوستان سے واپس آتے وقت اٹاری کے سرحدی قصبے پر ہندوستان کے کسٹم کے ایک افسر سے جیسے ہی ان کی نظریں چار ہوئیں وہ چونک گئے۔
یہ بسنت سنگھ تھے۔ دونوں گلے مل کر بہت خوش ہوئے۔ بہت دیر تک پرانی دوستی، پرانے پڑوس اور بچوں کی باتیں کرتے رہے۔ لیکن بسنت نے ایک بار بھی اپنے زیورات کے بارے میں نہیں پوچھا۔ ملک فہد جیسے ہی زیورات کی بات کرتے بسنت سنگھ بات بدل دیتے۔
آخر کار ملک فہد نے اپنی بات کہہ ڈالی۔

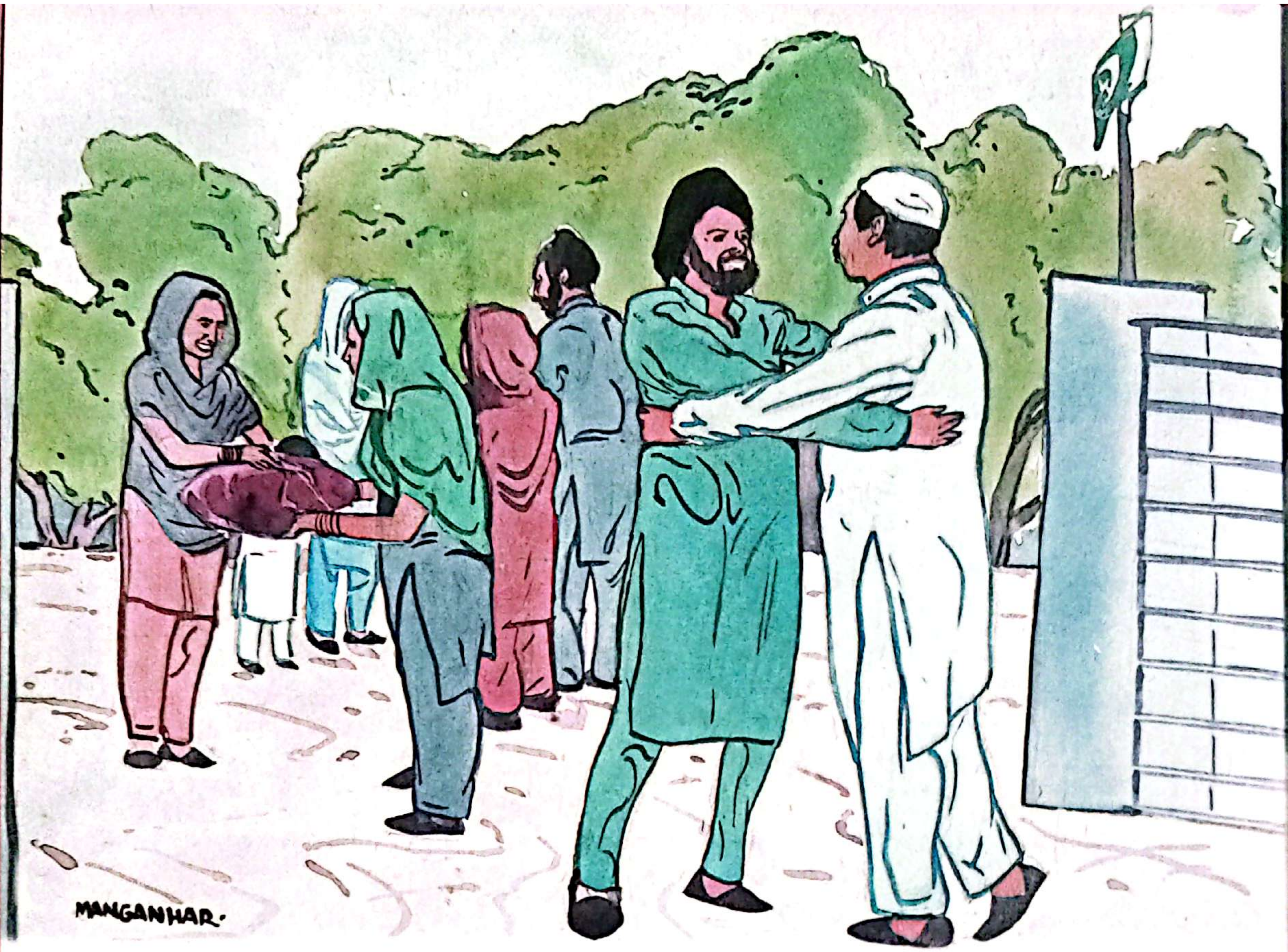
بسنت سنگھ کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ ان کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ملک فہد نے ان کے زیورات کی کیل کیل احتیاط سے رکھی تھی۔ وہ ہر وقت خدا سے دُعا کرتے تھے کہ زیورات کا مالک اور میرے دوست بسنت سنگھ کا پتہ چل جائے۔

اب ملک فہد نے سوچا کہ کوئی ترکیب نکالی جائے کہ یہ بوجھ میرے اوپر سے جلد سے جلد اُتر جائے۔ ملک فہد کے بہت مرتبہ کہنے پر بسنت سنگھ نے اپنے افسر سے اجازت مانگی کہ وہ دونوں ملکوں کی درمیانی سرحد پر اپنے دوست ملک فہد سے مل سکیں۔

اجازت تو مل گئی لیکن بہت مشکل سے۔ ملک فہد گھر آئے۔ رُوبی کو بسنت سنگھ سے ملنے کی داستان سنائی۔ روبی نے بھی سکون کی سانس لی جیسے ان کے اُوپر سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہو اور سہیلی سے ملنے کی خوشی الگ۔

اگلے دن ملک فہد کا سارا خاندان واہگہ سرحد پر زیورات کی پوٹلی لے کر پہنچا۔ یہ زیورات کی پوٹلی پہلے دن کے بعد کبھی دوبارہ کھولی ہی نہیں گئی تھی۔ آج بھی سب زیور اس ہی لال کپڑے میں بندھے، مالکوں کا انتظار کر رہے تھے۔

بسنت سنگھ اپنی بیوی بیٹی داماد اور ان کے دو بچوں کو لے کر سرحد پر آئے۔ سب عورتیں گلے مل کر خوش ہوئیں۔ گیتا نے پوٹلی کھول کر بھی نہیں دیکھی۔

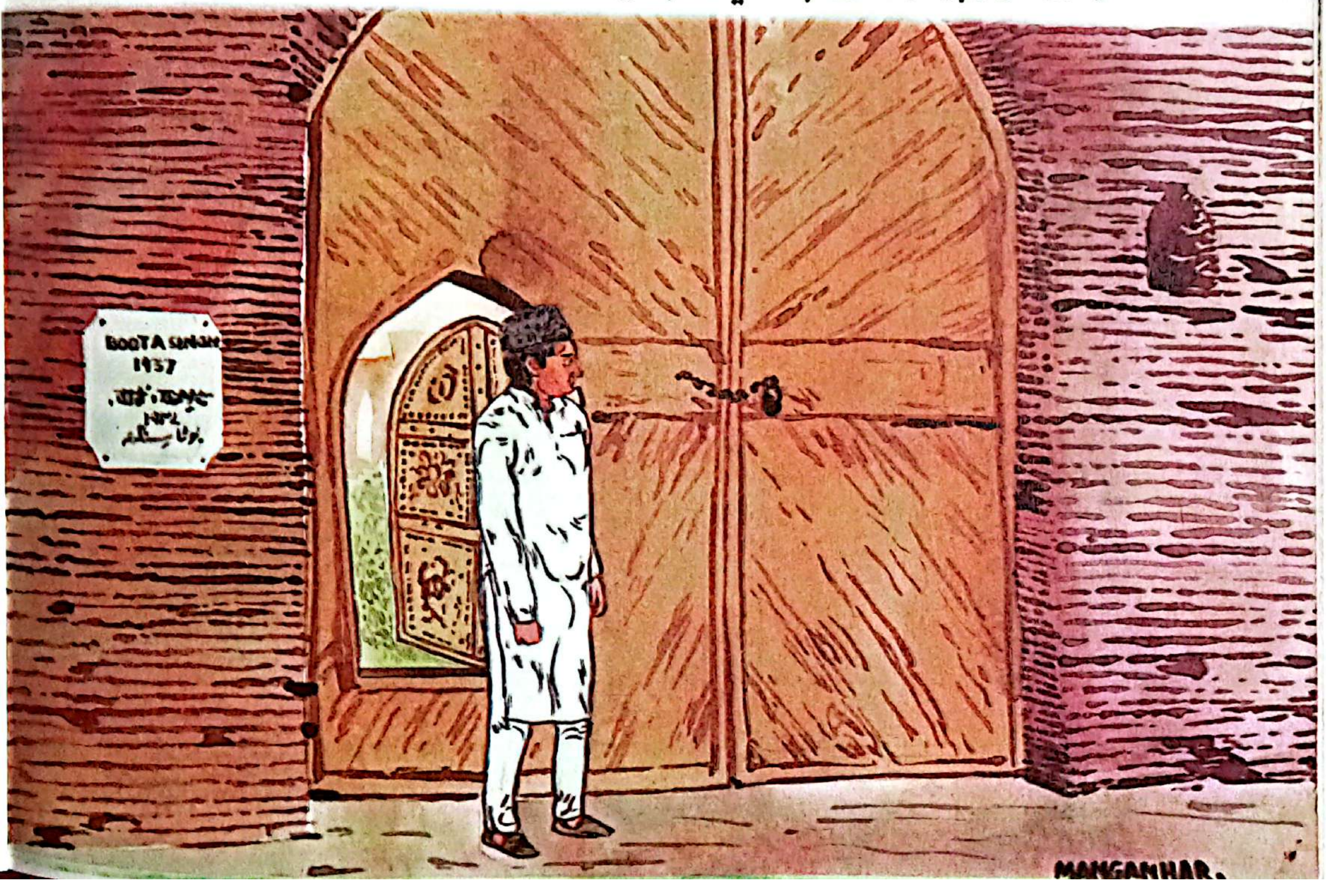


وہ تو اپنی سہیلی روبی اور اس کے بچوں کو دیکھ کر ہی خوش تھی۔
گھنٹوں دونوں خاندان باتیں کرتے رہے۔ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔
پتہ چلتا بھی کیسے، بہت دنوں میں بہت ساری باتیں جو جمع ہو گئیں تھیں۔
دیکھا بچو! اچھے مسلمان کبھی بھی امانت میں خیانت نہیں کرتے۔ اس کے لئے وہ ہر قربانی دیتے ہیں۔

(بچو! یہ سچی کہانی مسز طلعت عارف نے سنائی تھی۔ طلعت عارف کے والد کسٹم میں تھے اور واہگہ کسٹم پر ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا اٹاری اور واہگہ بہت قریب قریب ہیں۔)

بُوٹا سنگھ کی سرائے

راولپنڈی میں سید پوری گیٹ کے پاس ایک پرانا سا بڑا گھر ہے۔ جس کو بُوٹا سنگھ کی سرائے کا نام دیا گیا ہے۔ بٹوارے سے پہلے بھی اس گھر کو بُوٹا سنگھ کی سرائے ہی کہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ پہلے اس گھر میں بُوٹا سنگھ کا خاندان رہتا تھا۔ بُوٹا سنگھ بہت سمجھ بوجھ والے آدمی تھے۔ اس محلے کے پُرانے رہنے والوں نے بتایا کہ بُوٹا سنگھ کا گھر پورے محلے والوں کے لئے ہر وقت کُھلا رہتا تھا۔ وہ بہت زیادہ مہمان نواز تھے۔



شاید اسی وجہ سے محلے والے اس گھر کو بُوٹا سنگھ کی سرائے کہنے لگے تھے۔
پاکستان اور ہندوستان بنے تو بُوٹا سنگھ اپنے محلے کے دوسرے لوگوں کے
ساتھ ہندوستان چلے گئے اور ناصر الدین صاحب جب پاکستان پہنچے تو
ان کی قسمت کہ ان کو بُوٹا سنگھ کا گھر ملا۔

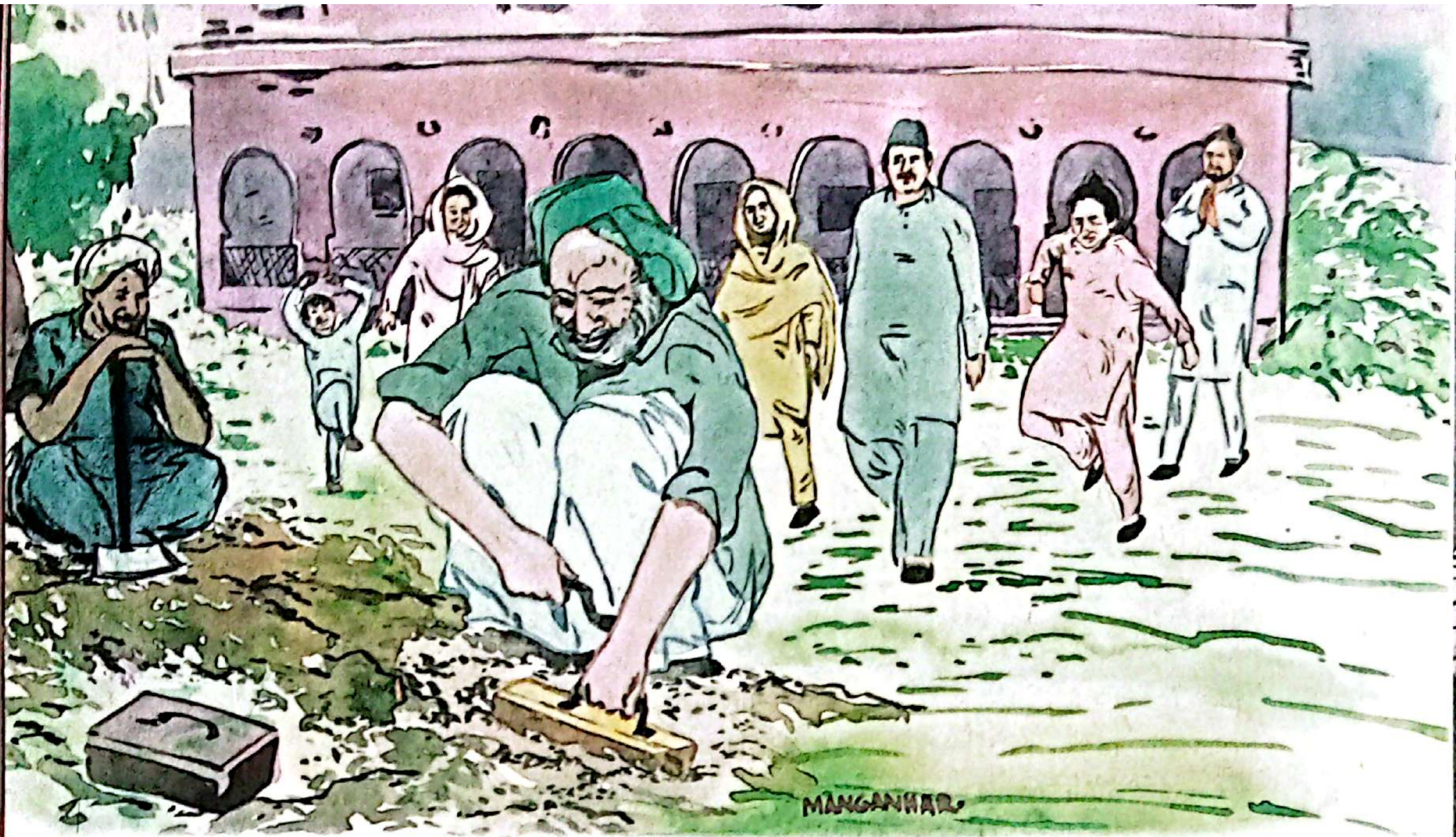
ناصر الدین کا خاندان یہاں آ کر بس گیا۔ یہ گھر ان کے لئے
بہت مبارک ثابت ہوا۔ ان کے سب بگڑے ہوئے کام بن گئے۔
وہ اپنے حالات سے بہت خوش تھے۔

بہت عرصہ بعد بُوٹا سنگھ اپنے خاندان والوں کو لے کر پاکستان آئے اور
راولپنڈی میں اپنے پرانے محلے بھی گئے۔ سب پرانے دوستوں سے ملے۔
ان سے مل کر سب ہی خوش ہوئے۔ سچ بات یہ کہ ان کی کسی سے دُشمنی
نہیں تھی۔ بُوٹا سنگھ کو سب اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کتنے اچھے تھے۔

بُوٹا سنگھ اپنا گھر دیکھنا چاہتے تھے، لیکن وہ ناصر الدین صاحب کو
نہیں جانتے تھے۔ بُوٹا سنگھ نے محلے کے دوسرے دوستوں سے سفارش
کی کہ وہ ان کا ناصر صاحب سے تعارف کروا دیں اور اجازت دلوا دیں تاکہ
وہ اپنے گھر میں جا سکیں۔ ناصر صاحب کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔
اُنہوں نے خوشی سے اجازت دے دی۔

بوٹا سنگھ اور ان کے خاندان والے بہت دیر اپنے گھر میں رہے۔
اب انہوں نے ناصر صاحب سے ایک درخواست کی۔
انہوں نے کہا" ناصر صاحب اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے گھر سے اپنا کچھ سامان لے جائیں۔ یہاں ہم اپنا بہت قیمتی سامان چھوڑ گئے تھے۔"
ناصر صاحب چونک گئے۔ "یہاں! آپ کا سامان؟ ہم تو یہاں دس بارہ سال سے رہتے ہیں۔ گھر کا کونا کونا دیکھا بھالا ہے۔ آپ کا ایسا کوئی سامان یہاں نہیں ہے جو آپ لے جا سکیں۔ ہاں بڑی بڑی الماریاں اور پلنگ ہیں یہ آپ ضرور لے جایئے۔"

بوٹا سنگھ ہنسنے لگے۔ انہوں نے کہا۔ "ایسا کچھ سامان یہاں نہیں ہے۔
آپ کے گھر کی کوئی چیز اپنی جگہ سے نہیں ہلے گی۔
ہمیں اچھی طرح پتہ ہے کہ اگر ہمارا سامان ہے تو کس جگہ ہے؟"
ناصر الدین صاحب کیا کرتے اجازت دے دی۔ اجازت ملی تو بوٹا سنگھ اور ان کے گھر والے اُٹھ کر پیچھے باغ میں چلے گئے۔
ناصر صاحب کے گھر والوں نے باغ کو خوب سجا بنا لیا تھا اور زمین خوبصورت گملوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ بوٹا سنگھ نے باغ کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا اور ناصر صاحب سے اجازت مانگی،
"ہم یہاں سے گملے ہٹا سکتے ہیں؟" "کیوں نہیں۔" ناصر صاحب نے کہا۔



بوٹا سنگھ نے اور ان کے گھر والوں نے مل کر گملے ہٹائے اور باغ میں پڑے ایک کدال اور کُھرپی سے کھدائی شروع کر دی۔ تھوڑی سی کھدائی کے بعد لوہے اور دھاتوں کے چھوٹے بڑے صندوق نظر آنے لگے۔ سب ہی کی نظر ان پر پڑی۔ ناصر صاحب کے گھر والے تو چیخ پڑے۔

بوٹا سنگھ چونکہ آرام سے پروگرام بنا کر گئے تھے، اسی لئے انہوں نے گھر کی قیمتی چیزیں اور عورتوں کے سونے، موتی کے زیورات گھر کے پچھواڑے کی زمین میں چھپا دیئے تھے۔ اتفاق دیکھئے کہ ان کی رکھی ہوئی ہر چیز ابھی تک محفوظ تھی۔

ناصر صاحب نے بوٹا سنگھ سے پوچھا۔ ''آپ کو یہ کیسے یقین تھا کہ آپ کی

قیمتی چیزیں اور زیور یہاں محفوظ رہے گا؟ کسی نہ کسی وجہ سے ہم زمین کھود بھی سکتے تھے''

بُوٹا سنگھ نے کہا۔ ''اگر آپ کھود لیتے اور آپ کو یا کسی کو بھی ہماری یہ دولت مل جاتی تو یہ اس کی اور ہماری قسمت تھی۔ ہم یہاں آنے سے پہلے تیار تھے کہ اگر ہمارا سامان مل گیا تو خیر ہے نہیں ملا تو کوئی بات نہیں۔ یہ تو مال و دولت ہے آپ نے اور ہم نے تو اپنے پیاروں کو کھو دیا اور صبر کر لیا ہے۔ ہمارے پاس اوپر والے کا دیا ہوا بہت کچھ ہے۔ یہاں جب ہم رہتے تھے تب بھی دینے والے نے ہمیں بہت کچھ دیا تھا اور اب امرتسر میں رہتے ہیں وہاں بھی سب کچھ ہمارے پاس ہے۔''

بُوٹا سنگھ نے ایک اور بات بھی کہی۔ ''ناصر صاحب یہ گھر اب آپ کا ہے۔ یہ زمین آپ کی ہے۔ یہاں جو کچھ ہے وہ آپ کا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو یہ سامان میں لے جاؤں اور اگر آپ منع کر دیں تو میں ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔''

ناصر صاحب خود بھی بہت اچھے دل کے، اللہ والے آدمی تھے۔ ایسی بات تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے بُوٹا سنگھ کو خوشی سے اجازت دے دی۔ اسی طرح ناصر صاحب نے بُوٹا سنگھ کی امانت واپس لوٹا دی۔ وہ اس بات پر بہت خوش ہوئے کہ جس کی امانت تھی اُس کے پاس پہنچ گئی۔

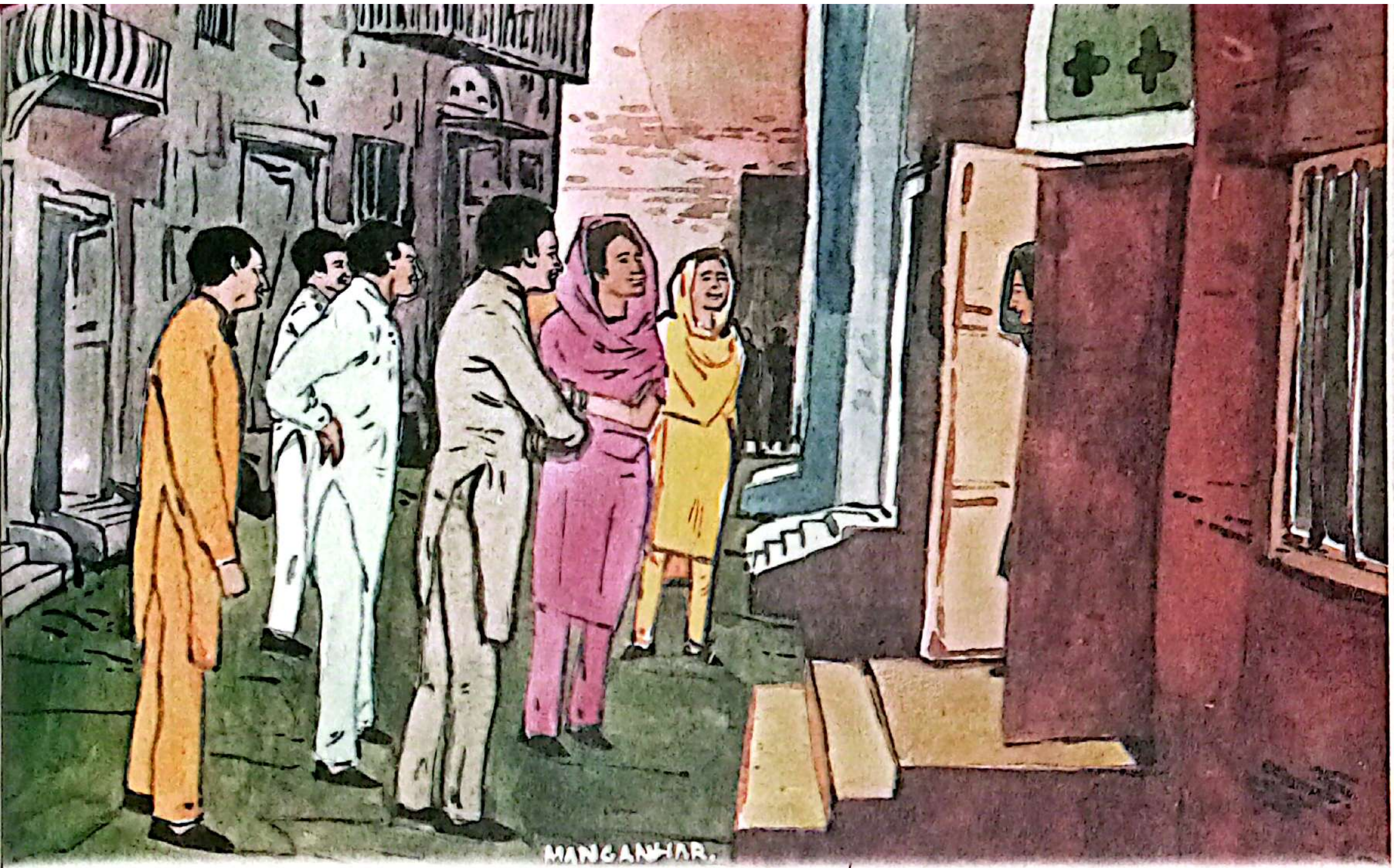
(بچو! یہ سچی کہانی مجھے خالد حفیظ صاحب نے سنائی تھی جو بُوٹا سنگھ کے ہمسائے تھے۔)

دِیدی

تقسیم کے کئی سال بعد ہندوستان کے ایک کالج کی ٹیم لاہور کے ایک کالج کے ساتھ ہاکی کا میچ کھیلنے پاکستان آئی۔ لاہور کی ٹیم کے کھلاڑی وسیم نے ہندوستانی ٹیم کے کھلاڑیوں کو اپنے گھر دعوت پر بلایا۔

جیسے ہی ہندوستانی کھلاڑی، وسیم کے گھر پہنچے ان کا ایک ساتھی سُریندر جو ٹیم کا گول کیپر بھی تھا کچھ پہچان کر چونک گیا۔ اس نے
وسیم کی امی سے کہا۔ ''آنٹی اس ہی سڑک پر تو میرا گھر بھی تھا
نہ جانے اس میں اب کون رہتا ہو گا؟''
وسیم کی امی نے گھر کا پتہ پوچھا تو پتہ چلا کہ دو تین گھروں کے بعد ہی سُریندر کا پرانا گھر ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ خلیق مرزا صاحب
اس گھر میں رہتے ہیں۔

بچو! جب ملک تقسیم ہوتے ہیں اور لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتے ہیں تو بس چل پڑتے ہیں۔ اسٹیشن یا ائیرپورٹ پر کوئی لینے نہیں آتا ہے، نہ یہ پتہ ہوتا ہے کہ کہاں جائیں گے؟
بس جہاں سینگ سمائے ڈیرہ ڈال دیا۔



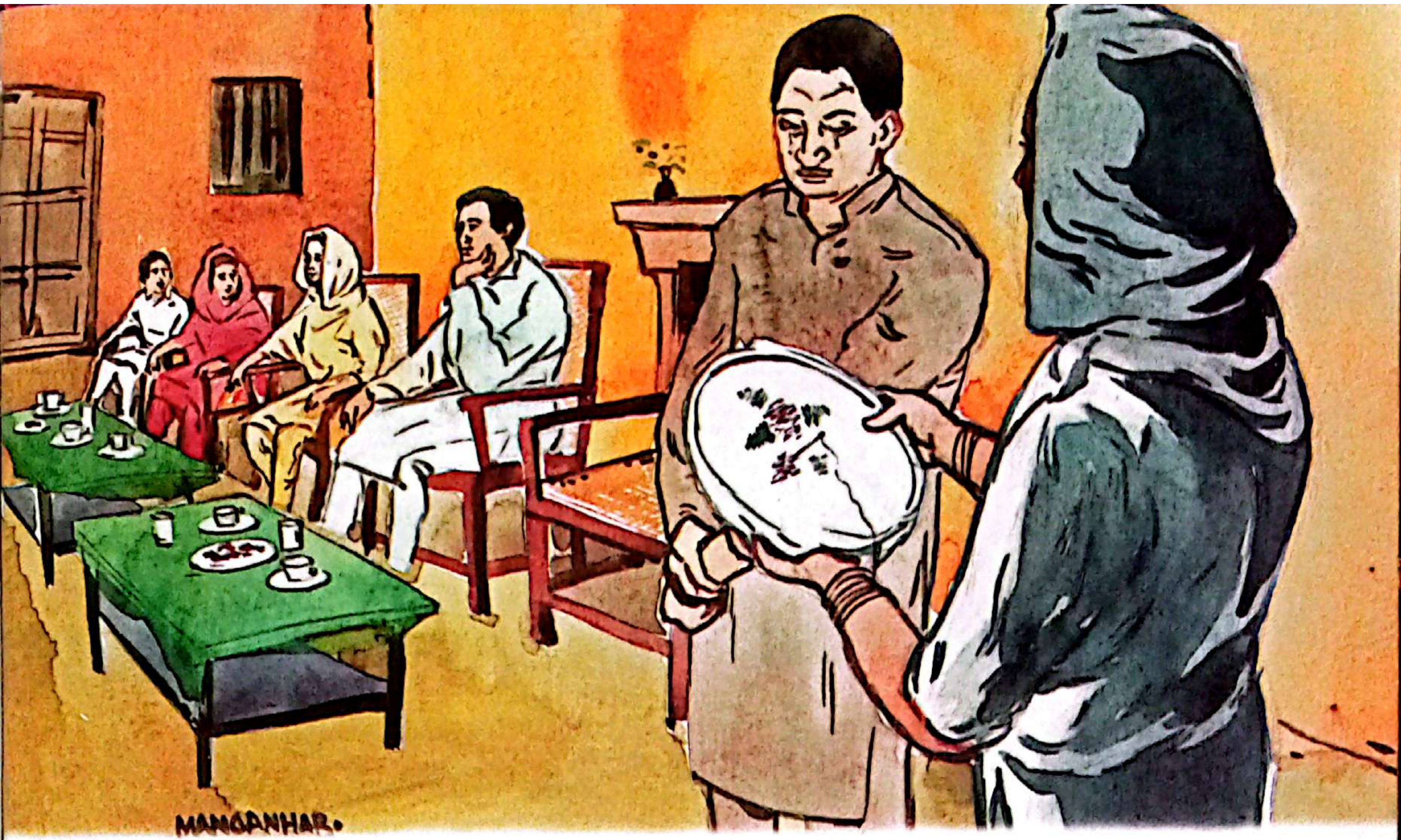
سُریندر کے گھر والے یہ گھر چھوڑ کر ہندوستان گئے ہوں گے اور خلیق مرزا صاحب کسی گھر کو چھوڑ کر لاہور آئے ہوں گے۔ ان کی قسمت کہ انہیں وہ گھر ملا جو سُریندر کے گھر والے چھوڑ کر گئے تھے۔
''کیا میں وہاں جا سکتا ہوں؟ آنٹی میں اپنا گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔''
سُریندر نے کہا۔ ''کیوں نہیں ضرور ضرور۔'' وسیم کی امی نے کہا اور خلیق مرزا صاحب کے یہاں کہلوا دیا کہ آپ کے گھر ایک خاص مہمان آنا چاہتا ہے۔ وہ لوگ کیوں منع کرتے۔ خوشی سے راضی ہو گئے۔ کھانا کھانے کے بعد سُریندر اپنے سب ساتھیوں اور میزبانوں کے ساتھ خلیق مرزا صاحب کے گھر گیا۔

گھر دیکھتے ہی اس کو اپنا بچپن، اپنی بچھڑی ہوئی دِیدی، پرانے دوست نہ جانے کیا کیا یاد آ گیا۔ بہت دیر تک ایک ایک چیز کو دیکھتا رہا۔

لیکن جب وہ ایک آتش دان کے پاس پہنچا تو اس پر ہاتھ رکھ کر سوچوں میں گم ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "جب ہم یہ گھر چھوڑ کر گئے تھے اس وقت کچھ بھی ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ میری دِیدی کو کڑھائی کرنے کا بہت شوق تھا۔ جب ہمیں اچانک بھاگنا پڑا تو دِیدی اس وقت بھی کڑھائی کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک فریم تھا وہ فریم میں اس آتش دان پر سجانے کے لئے پھولوں کا ڈیزائن بنا رہی تھی۔ بابا نے اس کے ہاتھ سے وہ پھولوں کا ڈیزائن چھین کر پھینکا اور ہم سب کو باہر نکالا۔ مجھے یاد ہے کہ دِیدی مُڑ مُڑ کر اپنے فریم کو دیکھتی تھی اور اس کے آنکھوں میں آنسو تھے۔

ہندوستان پہنچنے سے پہلے ہی وہ ہمیں چھوڑ گئی۔ میری دِیدی بہت پیاری تھی۔ اس کی یاد مجھے ہر وقت آتی ہے۔ اس کی کڑھائی والا فریم آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ایسے ہی ہے جیسے میری دِیدی کا چہرہ ہو۔"

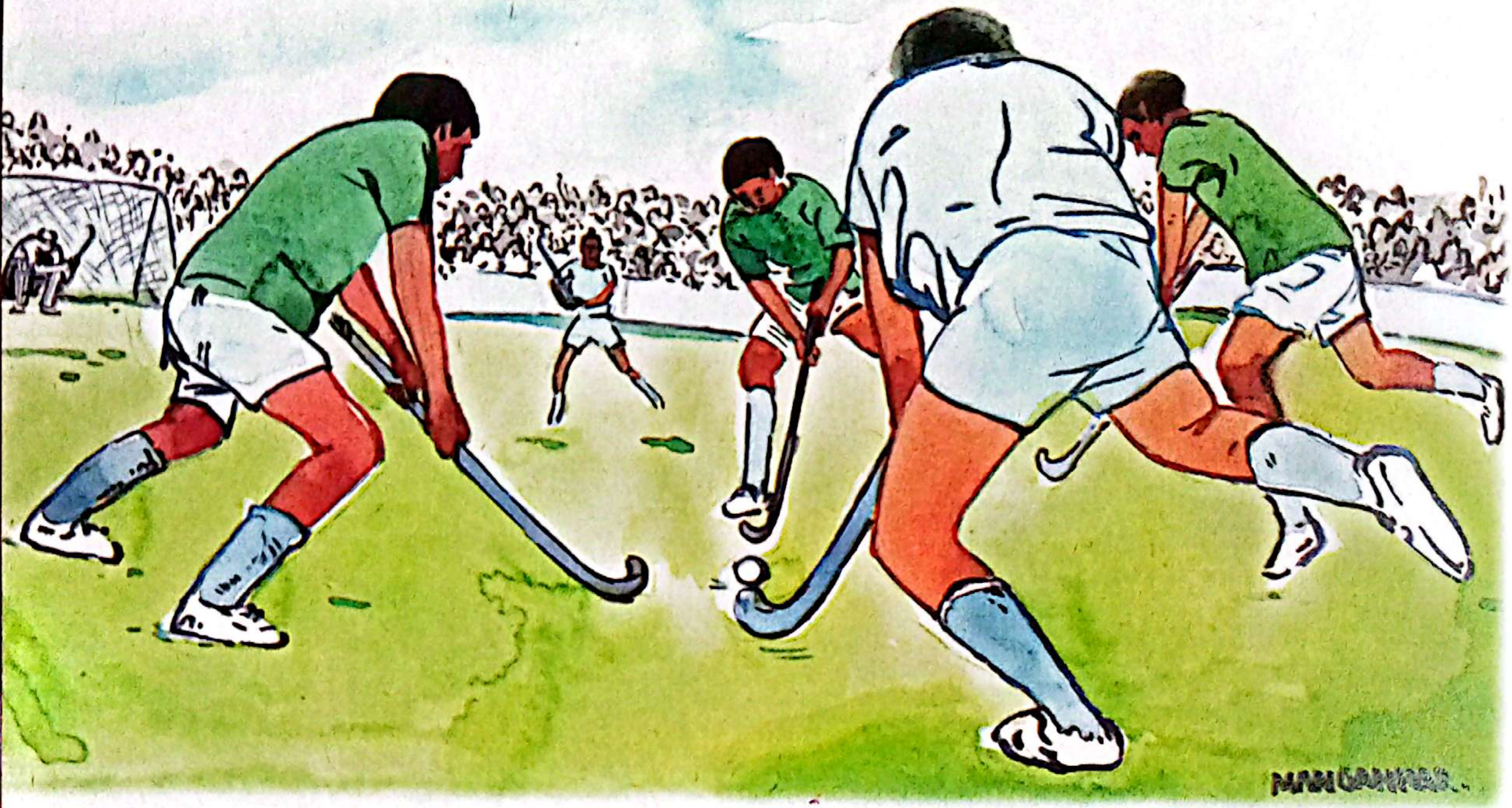
سب افسردہ ہو گئے۔ پھر خلیق صاحب کی بیگم نے الماری کے اُوپر سے ایک ڈبہ اُتارا، اس کو کھولا، اس کے اندر سے تھیلے میں بند ایک فریم نکالا۔



ابھی تک سُریندر کچھ بھی نہ سمجھا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہیں؟ انہوں نے فریم لاکر سُریندر کے ہاتھ میں دے دیا۔ فریم وہی تھا جو سُریندر کی دِیدی کی آخری نشانی تھی۔ دِیدی کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی وہ خوبصورت کڑھائی آج بھی ایسی لگ رہی تھی جیسے دِیدی اس میں سوئی اٹکا کر ابھی ابھی ماں کی آواز سن کر دوسرے کمرے میں چلی گئی ہے۔ وہ آئے گی اور دوبارہ کاڑھنا شروع کر دے گی۔

سُریندر نے فریم ہاتھ میں پکڑا، اس کے پاس ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں تھے۔ وہ خلیق صاحب کی بیوی کی طرف دیکھتا تھا اور فریم کو پیار کرتا تھا۔ اس نے فریم کو آنکھوں سے لگایا اور خوب رویا۔

اس کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔



خلیق صاحب کے گھر والوں نے یہ فریم اور ایسی بہت سی چیزیں جن سے کسی کی یادیں جڑی ہو سکتی ہیں سُریندر کو واپس کر دیں۔

کچھ ہی دیر کے بعد سُریندر بالکل بچوں کی طرح خوش تھا۔ اس کو ایسا لگتا تھا جیسے اس کی دِیدی واپس آ گئی ہو۔ سنا ہے اگلے دن سُریندر نے بہت گول کیے وہ کہتا تھا ''آج میری دِیدی میرے ساتھ ہے۔''

(بچو! یہ سچی کہانی جو ابھی آپ نے پڑھی مجھے مسز ہما مرزا نے سنائی تھی۔ خلیق مرزا صاحب ان کے ماموں تھے۔ وہ اب بھی لاہور میں اس ہی گھر میں رہتے ہیں)

سُکھی اور دادی ماں

دادی ماں نے کہانی ختم کی تو دیکھا کہ خالد تو جمائیاں لے رہا ہے اور سُکھی گہری نیند سو رہا ہے۔ روز ہی کہانی ختم ہوتے ہوتے سُکھی اسی طرح گہری نیند سو جاتا۔ کبھی کبھی بڑوں کی طرح خراٹے بھی لیتا لیکن دادی ماں کو اچھی طرح پتہ ہوتا کہ سُکھی سویا نہیں ہے، بس جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر لی ہیں۔ تاکہ خالد کے گھر سونے کا بہانہ مل جائے۔

شام ہوئی، کھانا کھایا اور سُکھ بیر سنگھ (سُکھی) ماں سے کہتا، ''ماں میں دادی کے پاس جا رہا ہوں، کہانی سننے۔'' دادی ماں کے ایک گھٹنے پر سُکھ بیر اور دوسرے پر خالد ہوتا۔ دونوں کی آنکھیں دادی ماں کے مُنہ پر ہوتیں۔ سُکھی کے گھر میں تو کوئی دادی ماں نہ تھیں۔ وہ یہی جانتا تھا کہ خالد کی دادی ہی میری دادی ہیں۔ بڑے بھائی تو بہت بڑے تھے، کوئی دوست تھا تو خالد تھا۔

ایک دن سُکھی اپنی ماں کا مُنہ پکڑ کر کہنے لگا ''ماں تم اپنا منہ دادی کی طرح کر لو، پھر میں تم سے کہانی سن لیا کروں گا۔'' ماں نے کہا۔ ''ارے بیٹا مجھے فرصت کہاں ہے، تیرے بڑے بھائیوں سے اور تیرے بابا سے؟ کہانی سنانے کے لئے تیری دادی ماں ہی اچھی ہے۔''



''میری دادی ماں تو دنیا میں سب سے اچھی ہے۔'' سُکھی نے کہا۔

خالد اور سُکھی پڑوسی تو تھے ہی، ہر وقت کے ساتھی بھی تھے۔

خالد کے بغیر سُکھی کچھ دیر گزار سکتا تھا، لیکن دادی ماں سے کہانی سنے بغیر سو نہ سکتا تھا۔ ایک دن کسی بات پر خالد اور سُکھی کی لڑائی ہو گئی۔

رات ہونے کو آئی، کہانی سننے کا وقت آگیا۔ سُکھی، خالد کے دروازے پر کھڑا یہی سوچ رہا تھا کہ دادی ماں نظر آئیں تو ان کو آواز دے۔

کچھ دیر انتظار کر کے دادی ماں نے دروازے پر آکر آواز لگائی،

''سُکھی بیٹا کہاں ہو؟ کہانی نہیں سُنو گے؟''

دادی ماں کے پاؤں کے پاس کھڑے ہوئے سُکھی نے آہستہ سے کہا۔

''دادی ماں میں یہاں ہوں، کیسے آؤں خالد سے لڑائی جو ہو گئی۔''

پہلے تو دادی ماں ڈر گئیں، جیسے کوئی بلی پاؤں کے پاس کھڑی ہو۔ پھر مسکھی کو پیار سے گود میں بھر لیا کہنے لگیں، ''ارے کیا کہانی سے لڑائی ہو گئی؟ یا دادی ماں سے لڑائی ہو گئی؟ جلدی سے آجا دوستی بھی ہو جائے گی۔'' بڑا مزے دار نظارہ تھا، جسے دیکھ کر سب گھر والوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ خالد اور مسکھی روز کی طرح دادی ماں کے دونوں گھٹنوں پر بیٹھے تھے، لیکن ایک دوسرے سے پیٹھ کئے ہوئے۔ دادی بھی خوب ہنس رہی تھیں۔ انہوں نے آہستہ آہستہ دونوں بچوں کے ہاتھ ملوا دیئے اور دوستی بھی کروا دی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان بننے کا اعلان ہوا تھا۔ مسکھی اور خالد کے گھر والے لاہور کے پاس ہی ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ مسکھی کے گھر والوں نے ہندوستان جانے کا ارادہ کیا۔ گھر میں بات ہوتی تھی، چھوٹے سے مسکھی نے یہ بات سنی اور ایک دن سنا کہ کل یہاں سے چلے جائیں گے۔ ''کہاں چلے جائیں گے ماں؟'' مسکھی بہت رویا۔
روتا جاتا اور کہتا، ''میں کہیں نہیں جاؤں گا اور اگر جاؤں گا تو خالد کو اور دادی ماں کو ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔''
ماں باپ نے ٹالنے کو کہہ دیا ''اچھا بابا لے جائیں گے، آج جب کہانی سننے جاؤ تو دادی ماں سے کہہ دینا کہ وہ اور خالد ہمارے ساتھ چلیں۔''



رات کو جب کہانی کا وقت آیا تو مُسکھی نے دادی ماں سے پوچھا۔

''دادی ماں تم اور خالد میرے ساتھ چلو گے نا؟ میرے بابا سب کو لے کر کہیں دور جا رہے ہیں۔ میں تمہارے بغیر نہیں جا سکتا۔''

دادی نے بہت سمجھانے کی کوشش کہ وہ نہیں جا سکتیں، لیکن مُسکھی روتا ہی رہا اور دادی سے ایسے چمٹ کر بیٹھ گیا جیسے اس کی دادی کو کوئی چھین رہا ہے۔

روز کی طرح کہانی ختم ہوتے ہوتے مُسکھی جھوٹ مُوٹ سو گیا۔

دادی ماں نے آواز دی ''اٹھو مُسکھی بیٹا گھر جاؤ۔'' یہ کہتے کہتے دادی ماں بھی رو دِیں۔

مُسکھی آج ایک ہی بار کہنے پر اٹھ گیا۔ نہ دادی ماں کو پیار کیا نہ خالد سے بات کی اور چلا گیا۔

رات کو گیارہ بجے سُکھی کے ماں باپ نے خالد کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''خالد بیٹا کہاں ہو؟ سکھی کہاں ہے؟ ابھی تک گھر نہیں آیا۔'' گھر میں تو ہل چل مچ گئی۔ دادی نے بتایا کہ سُکھی کو گم ہوئے دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔ دونوں گھروں میں ہر جگہ سُکھی کو ڈھونڈا گیا۔ سب ہی پریشان تھے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر یہ وقت آ گیا کہ میلے کپڑوں کی ٹوکری بھی الٹ کر دیکھ لی۔ الماریاں کھول کھول کر دیکھ لیں۔ دادی ماں نے کہا ''میں باہر جا کر دیکھتی ہوں شاید بھینس کے چارے میں چھپ گیا ہو۔''

دادی ماں نے چپل اٹھانے کے لئے پلنگ کے نیچے ہاتھ ڈالا تو ہاتھ پڑا سُکھی کے ہاتھ پر۔ ''ارے یہ کیا؟'' دادی نے کہا۔ دادی ماں نے کیا دیکھا؟ دادی کے جوتوں کا تکیہ بنائے سُکھی پلنگ کے نیچے بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ سوتے ہوئے سُکھی کو ماں باپ نے اٹھایا۔ سب پڑوسیوں کو الوداع کہا اور صبح صبح اپنی منزل کے لئے چل پڑے۔

دادی ماں نے اس رات کے بعد پھر کبھی کہانی نہیں سنائی اور خالد بھی یہی کہتا۔ ''اب میں بڑا ہو گیا ہوں، کہانی تو بچے سنتے ہیں۔''

(بچو! یہ کہانی مجھے شیریں طلعت صاحبہ نے سنائی تھی۔ خالد نے بڑے ہو کر شادی کی اور لاہور آ گیا۔ اس کی کتابوں کی دُکان انارکلی بازار میں تھی۔ اس دُکان کے اوپر ہی شیریں کا گھر تھا۔)

انوکھا بیل

عارف کے بابا کو اپنے کھیتوں سے بہت پیار تھا اور کیوں نہ ہوتا، ان کو ہرا بھرا کرنے میں بابا نے محنت بھی بہت کی تھی۔ ان کے پاس دو موٹے موٹے بیل تھے۔ ان بیلوں کو وہ ہل میں جوت کر کھیتوں کی زمین نرم کرتے تھے۔ بیلوں کے علاوہ بہت سی گائیں اور بکریاں تھیں۔

خالص دودھ لسی پی پی کر چھوٹا سا عارف خوب موٹا تازہ ہو گیا تھا۔

عارف کے بابا کبھی کبھی مذاق میں کہتے۔ ''عارف اگر کبھی بیل بیمار ہو گیا تو تجھے ہل سے باندھ دوں گا۔''

لیکن عارف کی اماں ضرور یہ کہتیں۔ ''واہ! میرا عارف تو اسکول جائے گا اور اللہ نہ کرے بیل کیوں بیمار پڑے۔''

عارف سات سال کا ہوا تو پاس کے چھوٹے سے شہر کے ایک اسکول میں جانے لگا۔ پڑوسی چاچا رام لال کا بیٹا مدن لال بھی عارف کے ساتھ ہی اسکول جاتا۔ مدن، عارف کا سب سے پکا دوست تھا۔ گھر میں بھی اور اسکول میں بھی۔ لیکن دیکھنے میں عارف سے بہت چھوٹا لگتا تھا۔

بچو! عارف جب پندرہ سال کا ہوا تو ایسا لگتا تھا جیسے بیس پچیس سال کا ہو اور مدن لال ایسا دُبلا پتلا کہ پندرہ سال کی عمر میں دس بارہ سال کا ہی لگتا تھا۔

مدن لال کے بابا چاچا رام لال پورے گاؤں کے چاچا تھے۔ سارے گاؤں کے دوست تھے، سب کے ہمدرد تھے۔ کسی کا گھر بن رہا ہوتا تو چاچا مزدوروں کی طرح کام کرتے۔ کسی کے گھر شادی ہوتی تو چاچا اور چاچی جانکی سب ہی کاموں میں ہاتھ بٹاتے۔

پڑوسیوں کا تو وہ بہت ہی خیال رکھتے، خاص کر عارف کے بابا اور ماں کا۔

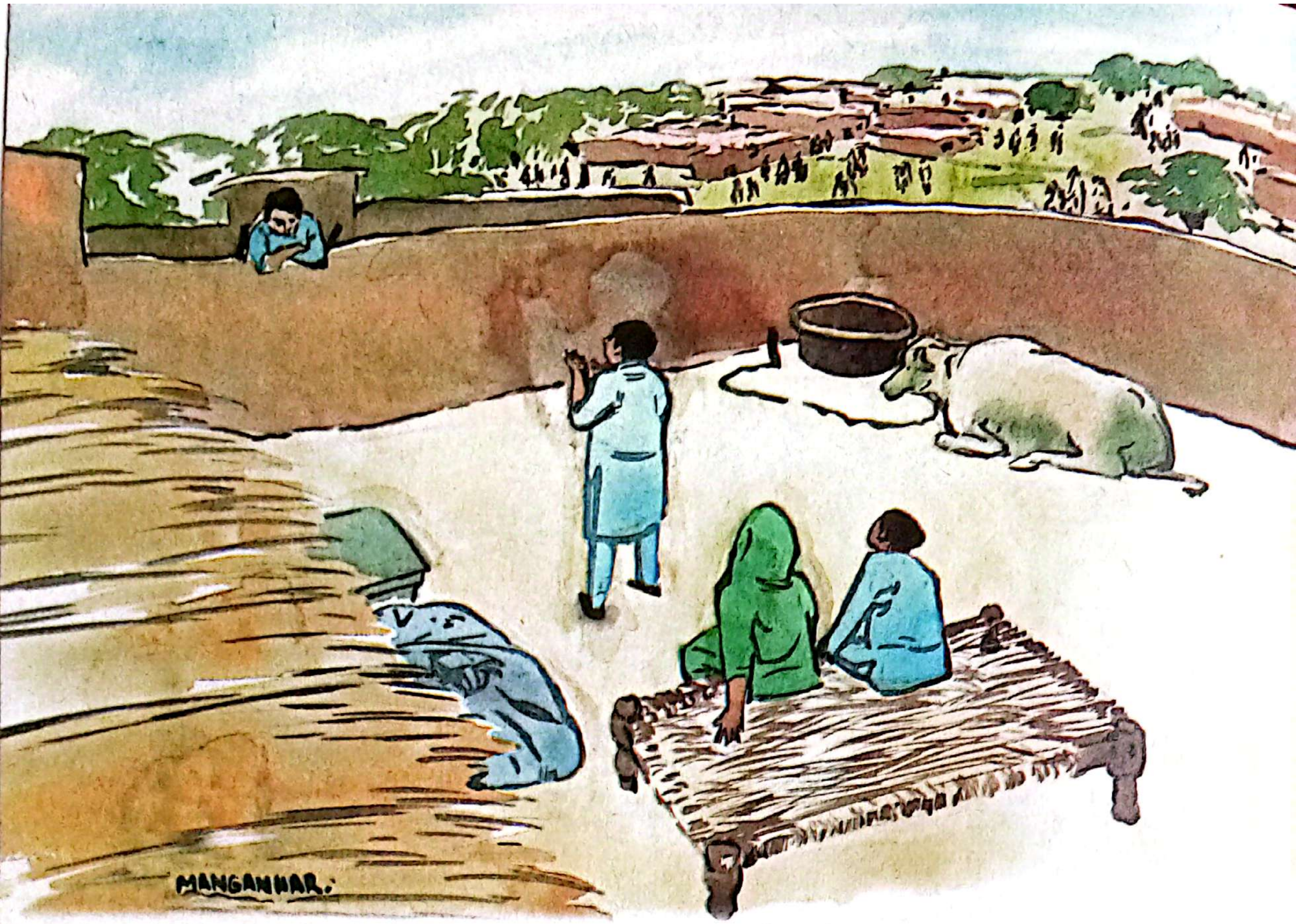
پاکستان اور ہندوستان بنا تو چاچا کی برادری کے بہت سے لوگ ہندوستان جانے کی تیاری کرنے لگے۔ یہ گاؤں سرحد کے پاس ہی تھا۔ چاچا نے بھی سوچا کہ انہیں بھی ہندوستان جانا چاہیئے۔

یوں تو انہیں گاؤں والوں سے کوئی شکایت نہ تھی۔ نہ گاؤں والے چاہتے تھے کہ وہ جائیں لیکن کچھ خراب لوگوں نے اس گاؤں میں بھی نفرت پھیلانے کی کوشش کی تھی اور کچھ لوگ ایک دوسرے کے دشمن بھی ہوگئے۔ لیکن یہ پڑوسی آخر دم تک دوست ہی رہے۔ باہر نہ ملتے تو دیوار پر سیڑھی لگا کر باتیں ہوتی تھیں۔

رام لال چاچا کی آواز آئی۔ ''عارف بیٹے ذرا بات سننا۔'' عارف نے جھٹ سیڑھی لگائی اور دیوار پر چڑھ گیا۔

''بیٹا تیرے اماں، بابا کہاں ہیں؟'' چاچا نے پوچھا۔

عارف نے کہا ''چاچا وہ بڑے تایا کے گھر نیاز پر گئے ہیں کل آئیں گے۔''



چاچانے کہا، ''بیٹا ہم لوگ کل صبح صبح ہندوستان چلے جائیں گے اپنی بیل گاڑی میں سب گھر والوں کو بٹھا کر لے جاؤں گا۔ اپنے اماں، بابا کو بتا دینا۔ ان سے نہیں مل سکا افسوس رہے گا۔ بھگوان سب کو خوش رکھے۔''

عارف کو دُکھ تو بہت ہوا، اس کے بچپن کا ساتھی مدن لال چلا جائے گا۔ پیار کرنے والے پڑوسی چلے جائیں گے۔ عارف نے کہا۔ ''چاچا میں صُبح جلد اُٹھ جاؤں گا، آپ کی مدد کر دوں گا اور مدن سے بھی مل لوں گا۔''

صُبح چار بجے بیل کی گھنٹیوں کی آواز آئی تو عارف کی آنکھ کھل گئی۔ باہر جا کر دیکھا تو چاچا کے سب گھر والے جانے کے لئے تیار تھے۔

سب گاڑی میں بیٹھ گئے تو عاف مدن سے باتیں کرتا ہوا گاڑی کے ساتھ ساتھ ہی چل پڑا۔ عارف نے سوچا کہ جب تک مدن کا ساتھ رہے اچھا ہے۔ باتیں کرتے کرتے عارف بہت دور آ گیا تھا۔ عارف نے مدن سے کہا ''اچھا دوست اب میں چلتا ہوں'' ابھی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ چاچا کے چیخنے کی آواز آئی، عارف اور مدن نے دیکھا کہ بیل زمین پر گر چکا ہے اس کے مُنہ سے خون نکل رہا ہے۔

''او ہو! کسی نے بیل کو زہر دے دیا۔'' چاچا نے کہا۔ ''اب کیا ہو گا؟'' عارف اور مدن نے جلدی جلدی بیل کو گاڑی سے کھولا۔ بیل بے چارا دُنیا ہی چھوڑ گیا۔ عارف نے کہا'' چاچا آپ پریشان نہ ہوں، اس بیل کے برابر تو آپ کا یہ بیٹا ہے۔ آپ کو سرحد تک چھوڑ کر آؤں گا۔''

اور عارف نے یہ بات سچ کر دکھائی۔ چاچی ان کی دو بیٹیاں سامان کے ساتھ گاڑی میں ہی بیٹھی رہیں۔ بیل کی جگہ عارف کھڑا ہو گیا۔ چاچا نے بھی مدد کی۔ دبلا پتلا مدن بھی کوشش کرتا رہا لیکن اس میں طاقت کہاں تھی؟

چاچا کے گھر والوں کو سرحد تک چھوڑ کر جب عارف واپس آیا تو وہ بہت خوش تھا۔ اب تک چاچا سب کی مدد کرتے رہے۔ آج عارف ان کے کام آیا۔



شام کو اماں، بابا آئے تو عارف نے بتایا کہ چاچا کہ گھر والے ہندوستان چلے گئے ہیں، اور یہ بھی کہ اس نے ان کی مدد کیسے کی؟

بابا نے عارف کی پیٹھ ٹھونکی۔ ''شاباش بیٹا، میں نہ کہتا تھا کہ تجھے ہل سے باندھ دوں گا، آج تو گاڑی سے باندھا گیا۔ تیرا کھایا پیا تیرے پڑوسی کے کام آیا۔''

دیکھا بچو آپ نے! اس گاؤں کے کسی آدمی نے دشمن بن کر بیل کو زہر دیا اور کسی نے بیل بن کر انھیں منزل تک پہنچایا۔

اچھے لوگ ہمیشہ دوسروں کے کام آتے ہیں۔

(بچو! رام لال چاچا نے یہ کہانی مجھے خود سنائی تھی۔ جو ہندوستان میں ہمارے شہر ہی میں رہتے تھے۔)

فرہنگ

آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ جانا	:	حیران ہو جانا
کَیل کَیل احتیاط سے رکھنا	:	چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی سنبھال کر رکھنا۔
بوجھ سر سے اتر جانا	:	چھٹکارا ملنا۔ کسی کے احسان کا بدلہ چکانا، قرض ادا کرنا۔
سرائے	:	مسافروں کے رہنے کی جگہ۔
سینگ سمانا	:	پناہ ملنا۔ گزر ہونا۔
ڈیرہ ڈالنا	:	رہائش اختیار کر لینا۔ کسی جگہ رہ جانا۔ قیام کرنا
دیدی	:	بڑی بہن۔
گود میں بھر لینا	:	پیار سے گود میں اٹھا لینا۔
ہل چل مچ جانا	:	پریشان ہو جانا۔ گھبراہٹ ہونا، افراتفری پھیل جانا۔
دنیا چھوڑ جانا	:	فوت ہو جانا۔
پیٹھ ٹھونکنا	:	شاباش دینا۔

سرگرمیاں

1 آپ کے عزیز و اقارب یا آس پاس میں ایسے افراد ضرور ہوں گے، جو قیام پاکستان کے وقت موجود تھے۔ آپ ان سے قیام پاکستان کے بارے میں حقیقی واقعات معلوم کریں اور پھر ان کو اپنی کاپی پر تحریر کریں۔

2 پاکستان بہت قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا۔ آپ کے خیال میں ہم اپنے ملک کو کس طرح مضبوط اور ترقی یافتہ بنا سکتے ہیں؟ ایک مضمون لکھیں۔

3 کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پاکستان بننا کیوں ضروری تھا؟

337

ملکیتِ حکومتِ پنجاب

قیامِ پاکستان کی سچّی کہانیاں

تخیلّاتی کہانیاں تو ہم سب اکثر پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ مگر جو مزا سچّی کہانیوں کے پڑھنے میں ہے وہ کسی اور میں کہاں! کیونکہ سچّی کہانیوں کے کردار حقیقی ہوتے ہیں۔

پاکستان بننے کے وقت مسلمانوں کے دلوں میں پاکستان اور اسلام سے محبت نے ہر کام آسان کر دیا، مگر ایسا کرنے میں انہیں کیسی کیسی مشکلات اور قربانیاں دینا پڑیں، آنے والی پاکستان نسل کے لئے یہ سب کچھ جاننا بہت ضروری ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب آج اور مستقبل کے بچوں میں پاکستان کی قدر و قیمت اور اس کے بننے میں آنے والی مشکلات کا احساس پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ عمرانہ مقصود کے قلم سے لکھی گئی کچھ ایسی ہی کہانیوں کا مجموعہ، قیامِ پاکستان کے حوالے سے پیشِ خدمت ہے۔

DFID Department For International Development

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

PMSP Punjab

969 0 01628 8